خلیل الرحمن اعظمیؒ

ایک بھولی بسری، عاق شدہ نظم کی دریافت

غزل کا ایک شعر تو وہ ایسا کہہ گئے جو ہزار شعروں سے بڑھ گیا ہے:

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

شاعر تو وہ تھے: اور سچے شاعر! جب جو کچھ جی میں آیا کہہ گئے، ترقی پسندی کا دور تھا، بیس بائیس سال کی عمر، تو وہ دھواں دھار، بم بار شاعری کی کہ کبھی کبھی سردار جعفری کو بھی مات دے دی، جیسے یہ نظم ''آئینہ خانے میں''۔

چلیں، خلیل صاحب کی وہ **عاق شدہ** نظم، یعنی انڈر گراونڈ یا جیل کا تحفہ ملاحظہ ہو:

''ہم نہیں مانیں گے
سرمایہ پرستی کی اس آزادی کو

ہم تو دیوانے ہیں!
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ یہ چند سیہ کاروں کا اک دھوکا ہے/
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک اُجالا نہیں، یہ آگ لگی ہے گھر میں
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ تصویر اُبھاری گئی ایوانوں کی کٹیاؤں کے پس منظر میں
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ تم پہلی وہ زنجیر بدل لائے ہو
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ چالاک شکاری کی کمیں گاہ ہے اب لندن میں
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ اب تیرگی آزاد پھرا کرتی ہے اس آنگن میں
اور دیوانے یہ کہتے ہیں کہ یہ نور نہیں جسم پہ ظلمت کے اُبھر آئے ہیں
کچھ کوڑھ کے داغ!

''ہم تو دیوانے ہیں، دیوانے ہیں، دیوانے ہیں
دوڑو اب لے کے ذرا طوق و سلاسل دوڑو
آج اس جیل کی دیوار کو کچھ اور بھی اونچا کر دو
ہم نہیں مانیں گے سرمایہ پرستوں کی اس آزادی کو
ہم نہیں مانیں گے کاغذ پہ چھلکتے ہوئے پیمانوں کو
ہم نہیں مانیں گے پردے پہ چمکتے ہوئے اس سورج کو
جس کو تم لائے ہو تاریکی کے گہواروں سے
اپنی جنتا کا لہو بیچ کے انگلینڈ کے بازاروں سے
جس کو تم لائے ہو، جمہور کی آزادی کا سودا کر کے
جس کو تم لائے ہو، اجداد کی تہذیب کو رسوا کر کے
مادرِ ہند کی گردن پہ چھری پھیر دی تم نے ہی تو اے جلّا دو
تم نے ہی ملک کو تقسیم کیا
تم نے ہی میرے دھڑکتے ہوئے اس قلب کو دو نیم کیا!

''رہزنو! ہند کی عظمت کو لٹانے والو
تم نے تقسیمِ وطن کے لیے سر جوڑ کے سازش کی تھی
اور انگریز کے قدموں کے تلے روندی ہوئی جنتا کو
کتنی صدیوں کی دبائی ہوئی، کچلی ہوئی اس جنتا کو
سالہا سال کی بھٹی میں سلگتی ہوئی اس جنتا کو
یہ دلاسا دیا، آزاد ہوا اپنا وطن
آج رخصت ہوئی وہ بادِ خزاں، جسم میں چبھتی ہوئی وہ بادِ سموم
آج نو خیز بہاروں سے لہک جائے گا یہ سارا چمن
تم نے اس درد کی ماری ہوئی مخلوق سے یہ جا کے کہا
روک لو اپنے دمکتے ہوئے اس آنسو کو
بھر لو سینے میں مچلتی ہوئی اس خوشبو کو
کہہ دو یہ قلبِ تپاں سے کہ مسرّت کا ترانہ گائے
کہہ دو یہ چشمِ فسردہ سے کہ جنت کا فسانہ دوہرائے!

''چند لمحوں کے لیے ہم نے بھی انگڑائی لی
چند لمحوں کے لیے ہم نے بھی ناسور پہ مرہم رکھا
چند لمحوں کے لیے ہم نے بھی اس جلتی ہوئی آگ پہ پانی چھڑکا
چند لمحوں کے لئے ہم نے بھی نادیدہ خلاؤں کا سہارا ڈھونڈا
لیکن اس طرح کہ جیسے کوئی خوابوں کا محل گر جائے
جیسے آنکھوں سے کبھی اپنی، تخیل کے مناظر اُڑ جائیں
دیکھتے دیکھتے نو خیز بہاروں کا نشہ ٹوٹ گیا
جسم میں چبھنے لگی آ کے وہی بادِ سموم
ایک ہی پل میں وہ فردوس سرابوں میں کہیں ڈوب گئی
تم نے تو لا کے ہمیں پھینک دیا اپنی بنائی ہوئی اس دوزخ میں
ایک ہنگامہ ہوا، شور اُٹھا، نعرے گونجے
چیخ چیخ اُٹھے یہ انسان جفاؤں سے بنائی ہوئی اس دوزخ میں!

''لیکن اے سنگ دلو، سنگ دلو، سنگ دلو!
تم کو اس درد کی، اس چیخ کی پروا کیا تھی؟
تم کو اس خون میں ڈوبی ہوئی تاریخ کی پروا کیا تھی؟
تم تو دہلی کے شبستانوں میں بُنتے رہے خواب
خلش درد سے ان آنکھوں کی نیند اُڑتی رہی
اوس پڑتی رہی ارماں پہ اُمید اُڑتی رہی
تم تو چنتے رہے دیواروں پہ، محرابوں میں رنگین چراغوں کی قطار
اشک کی بوند مری پلکوں میں آ آ کے مگر چبھتی رہی
تم تو پیتے رہے محفل میں یہ بہتی ہوئی آگ
تم تو پیمانوں کو ٹکراتے رہے، شعلوں کو بھڑکاتے رہے
تم تو گندم کے حسیں سانولے دانوں کو جلاتے رہے اک بھٹّی میں
بھوک اور پیاس کی ماری ہوئی مخلوق ترستی رہی اک روٹی کو
کھیت تکتے رہے اور سامنے دم توڑ رہا تھا وہ ہلوں کا مالک
لہلہاتی ہوئی فصلوں کے لیے جس کا پسینہ ٹپکا
اس کا گھر بھی رہا محروم اناجوں کی مہکتی ہوئی اک بالی سے
کارخانوں میں تو بُنتے رہے، لگتے رہے یہ اطلس و کمخواب کے ڈھیر
ریل پر لد کے یونہی جاتے رہے چاندی کے ٹکڑے لیکن
کارخانوں کا یہ مزدور ٹھٹھرتا رہا، سرما کی ہواؤں سے یونہی لڑتا رہا
تم تو گاتے رہے بربط پہ اہنسا کا ترانہ لیکن
سطحِ جمنا پہ بلکتے ہوئے انسانوں کا خوں بہتا رہا
تم تو سکھلاتے رہے دھرم کی باتیں، یوں ہی دیتے رہے تہذیب کا اخلاق کا درس

نام پر مذہب و تہذیب کے سر کٹتے رہے
عصمتیں لٹتی رہیں، آدم و حوّا کو برہنہ کر کے
شاہراہوں پر بڑی شان سے مذہب کے خداؤں نے تماشہ دیکھا
نوکِ خنجر پہ اُچھالے گئے بچوں کے تڑپتے لاشے
بستیاں جلتی رہیں خون کے سیلاب آئے
تم نے وہ آگ لگائی ہے کہ تپتی ہوئی دوزخ بھی ٹھٹھک کر رہ جائے
تم نے وہ فتنہ اُٹھایا ہے کہ ابلیس بھی شرما جائے!

''آج یخ بستہ تمنائوں کو پھر تڑپا دو
آج اس آگ سے ویرانوں کو پھر مہکا دو
قہقہے زور سے اس طرح لگاؤ کہ زر و سیم کے یہ سارے خدا کانپ اُٹھیں
ظلم اور جور کی یہ آتشیں تلوار بھی پانی ہو جائے
اے مری ارضِ مقدس کے پرستارو، اُٹھو لیکے نئی ایک کمند
آسماں آج زمیں پر بھی اُتر سکتا ہے
نئے انداز سے یہ عالمِ امکاں بھی سنور سکتا ہے
نورِ ایماں کے نگہبانو، مرے بت شکنو!
بڑھ کے تاریک صنم خانوں کو مسمار کرو
سنگ و آہن کے خداؤں کو نگوں سار کرو
چھین لو ہاتھ سے ظلمت کے یہ اُٹھتی ہوئی باگ
چھین لو سازِ شکستہ سے یہ ابلیس کا راگ
آج گرتے ہوئے آدم کو سنبھالو بڑھ کر
آہنی گرز اُٹھا لو بڑھ کر
اس طرح وار کرو/ اس طرح تیز یہ رہوار کرو

موت کا دیوتا تھرّا جائے
ہاتھ سے اس کے جہنم کے یہ کوڑے گر جائیں
اے مرے ہم سفرو! ایک نئے حشر کے پیغامبرو
پھونک دو بڑھ کے کوئی سور کہ آدم کی زمیں جاگ اُٹھے
آج دیرینہ خداؤں سے بھی لینا ہے حساب
آج شیطان کے چہرے سے اُلٹنی ہے نقاب
آج کہہ دو یہ شبستاں کے پریزادوں سے
کہہ دو یہ قصرِ طلسمات کے شہزادوں سے
کہہ دو سرمایہ کے بپھرے ہوئے جلّادوں سے:
بجھنے والے ہیں شبستاں میں ستاروں کے کنول'۔

☆

چلتے چلتے خلیل صاحب کو ۱۹۷۴-۷۵ء میں ملاحظہ فرمائیں، علی گڑھ میگزین ۱۹۷۳-۱۹۷۴ (جو ۱۹۷۵ میں شائع ہوا) میں شائع شدہ ان کی نظم ''نئے آدمی کی تلاش میں'':

نئے آدمی کی تلاش میں :

اور پھر یوں ہوا
جو پرانی کتابیں، پرانے صحیفے
بزرگوں سے ورثے میں ہم کو ملے تھے
انھیں پڑھ کے ہم سب یہ محسوس کرنے لگے
ان کے الفاظ سے
کوئی مطلب نکلتا نہیں ہے
جو تعبیر و تفسیر اگلوں نے کی تھی
معانی و مفہوم جو اُن پہ چسپاں کئے تھے
اب ان کی حقیقت کسی واہمے سے زیادہ نہیں ہے
اور پھر یوں ہوا
چند لوگوں نے یہ آ کے ہم کو بتایا
کہ اب ان پرانی کتابوں کو
تہہ کر کے رکھ دو
ہمارے وسیلے سے
تم پر نئی کچھ کتابیں اُتاری گئی ہیں
انھیں تم پڑھو گے
تو تم پر
صداقت نئے طور سے منکشف ہو گی
بوسیدہ و منجمد ذہن میں کھڑکیاں کھل سکیں گی
تمہیں علم و عرفان
اور آگہی کے خزینے ملیں گے
اور پھر یوں ہوا
ان کتابوں کو اپنی کتابیں سمجھ کر
انہیں اپنے سینے سے ہم نے لگایا
ہر اک لفظ کا ورد کرتے رہے
ایک اک سطر کو گنگناتے رہے
ایک اک حرف کا رس پیا
اور ہمیں مل گیا
جیسے معنی و مفہوم کا اک نیا سلسلہ
اور پھر یوں ہوا
ان کتابوں سے
اک دن یہ ہم کو بشارت ملی
آنے والا ہے دنیا میں اب اک نیا آدمی
لیکے اپنے جلو میں نئی زندگی
ہم اندھیری گپھاؤں سے
اوہام کی تنگ گلیوں سے نکلیں گے
ہم کو ملے گی نئی روشنی
اور پھر یوں ہوا
لانے والے کتابوں کے
اور وہ بھی جو اُن پہ ایمان لائے تھے
سب اپنے اپنے گھروں سے نکل کر
کسی سمت کو چل پڑے
ایسے اک راستے پر
جدھر سے نیا آدمی
آنے والا تھا
یا ہم کو اس کا یقین تھا
کہ وہ آئے گا
اور اسی سمت سے
بس اسی سمت سے آئے گا
اور پھر یوں ہوا
دیر تک ہم نئے آدمی کے رہے منتظر
دیر تک شوقِ دیدار کی اپنی آنکھوں میں مستی رہی
دیر تک اس کی آمد کا ہم گیت گاتے رہے
دیر تک اس کی تصویر
ذہنوں میں اپنے بناتے رہے
دیر تک اس خرابے میں اک جشن ہوتا رہا
اور پھر یوں ہوا
دیر تک
اور بھی دیر تک
جب نہ ہم کو ملا
آنے والے کا کوئی پتہ
اُس کے قدموں کی کوئی نہ آہٹ ملی
ہم نے پھر زور سے اُس کو آواز دی
اے نئے آدمی!
اے نئے آدمی!
اور یہ آواز اونچے پہاڑوں سے ٹکرا کے
بے نام صحراؤں سے لوٹ کے
پھر ہماری طرف آ گئی
اور پھر یوں ہوا
چند لوگوں نے سوچا
کہ شاید نیا آدمی
آئے گا اور ہی سمت سے
دوسرے چند لوگوں نے سوچا
اور پھر ہر طرف قافلے قافلے
اور پھر ہر طرف راستے راستے
اور پھر یوں ہوا
دیر تک اُس نئے آدمی کی رہی جستجو
اس کو آواز دیتے رہے چار سو
کو بہ کو، قریہ قریہ اُسے ہم بُلاتے رہے
منزلوں، منزلوں
خاک اُڑاتے رہے
اور پھر یوں ہوا
سب کے چہرے اسی خاک میں اٹ گئے
سب کی آنکھوں میں اک تیرگی چھا گئی
سب کو ڈسنے لگی راہ کی بے حسی
اور پھر سب وہ اک دوسرے کے لئے
اجنبی ہو گئے
اور پھر سب کے سب
دُھند میں کھو گئے
اور پھر یوں ہوا
ہم نے پھر گھر پہ آ کر
کتابوں کے اوراق کھولے
انھیں پھر سے پڑھنے کی خاطر اٹھایا
ہر اک سطر پر غور کرتے رہے دیر تک
اور ہر لفظ کو
دوسرے لفظ سے جوڑ کر
سلسلہ حرف و نغمہ کا، صوت و صدا کا ملاتے رہے
اور پھر یاس و امید کے درمیاں
ڈھونڈتے ہی رہے اُس نئے آدمی کا نشاں
اور ہمیں بس ملیں
اپنی آواز کی زرد، سوکھی ہوئی پتّیاں
اور پھر یوں ہوا
ہم سے سورج کئی روز روٹھا رہا
آسمانوں سے اٹھتی رہیں
تہہ بہ تہہ بدلیاں
کالی کالی نظر آئیں سب وادیاں
کالے گھر، کالی دیواریں، کالی چھتیں
کالی سڑکوں پہ چلتی ہوئی کالی پرچھائیاں
یہ زمیں
کالے ساگر میں ٹوٹی ہوئی ناؤ کی طرح سے ڈگمگانے لگی
موت کی نیند آنے لگی
اور پھر یوں ہوا
ہم نے اپنے گھروں میں
جلائے خود اپنے دیئے
ہم نے بکھرے ہوئے خواب، ٹوٹے ہوئے آئینے
پھر سے جوڑے
بجھے جسم کی راکھ سے
سر اُٹھاتے ہوئے ایک ننھے سے شعلے کو
اور اپنے چہرے میں
اک اور چہرے کو دیکھا
پھر اپنے لہو کی صدائیں سنیں
اور اپنے لئے آپ اپنی کتابیں لکھیں۔

☆☆☆

قیوم قائد، ایک خود نوشت

علی گڑھ میں میرے چار برس

1951ء یا 1952ء کا زمانہ تھا۔ سوشلسٹ پارٹی میں پھوٹ اور انتشار کا دور شروع ہو چکا تھا۔ میں نے بھی کچھ وجہوں کے تحت، اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ، سوشلسٹ پاری سے علاحدگی اختیار کر لی تھی۔ زندگی خالی خالی سی چل رہی تھی اور سامنے کوئی مقصد نہیں تھا۔ پٹنہ کالج کے سامنے بانکی پور کا ایک مشہور ہوٹل ''پٹنو ہوٹل'' کے نام سے چلتا تھا۔ اس کے بانی مالک ایک انقلابی بنگالی تھے۔ کچھ ان کے انقلابی ہونے کی وجہ سے اور کچھ کچوری، سنگھاڑا اور پپی ویلی چائے کی وجہ سے ہم لوگوں کا وہاں آنا جہاں اور اٹھنا بیٹھنا ہماری زندگی کا ایک مستقل حصہ ہو گیا تھا۔ ہم لوگ کئی لوگ ایسے تھے جو وہاں مستقلاً بیٹھتے تھے۔ ان میں میرے علاوہ محی الدین (حال لائبریرین، لا کالج ایم ایل سیکشن)، انیس الرحمٰن صاحب (حال خزانچی انجمن ترقی اردو بہار)، ڈاکٹر خطیب الرحمٰن، شاہ محمد مسعود، شہاب الدین محمد، مسعود عالم، محمد اوقیش وغیرہ تھے۔ اس مجلس میں کبھی کبھی کچھ نئے لوگ بھی آ جاتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد یہ گروپ (پٹنو گروپ) کے نام سے مشہور ہو گیا۔ یہاں زیادہ تر شعر و شاعری سے متعلق اور زیادہ تر ہلکی پھلکی باتیں ہوتی تھیں۔ جاڑوں کے دن تھے اور اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں چھٹیاں ہوتی تھیں۔ یہاں تین چھٹیاں ہوتی ہیں۔ ایک سمر ویکیشن، دوسرے ونٹر ویکیشن اور تیسرے اوٹم ویکیشن۔ اسی جاڑوں کی فرصت کے دنوں میں میرے بچپنے کے دوست مختار الدین احمد آرزو آئے ہوئے تھے۔ ایک روز سیدھے پٹنو میں آئے اور طویل گفتگو ہوئی اور اسی طویل گفتگو کے دوران میں ایک سوال انہوں نے یہ بھی کیا کہ ان دنوں میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے جواب میں کہا کہ کچھ نہیں۔ اس کے بعد تنہائی میں مجھے ایک مشورہ دیا کہ میں علی گڑھ چلوں اور وہاں پڑھنے لکھنے کا اچھا انتظام بھی ہے اور ماحول بھی۔ خالی بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں کچھ نہ کچھ کرنے کا انتظام ہو جائے گا۔ دوسرے روز کی گفتگو میں جو پہلے روز کے مقابلے میں زیادہ سنجیدہ تھی۔ یہ طے پایا کہ میں علی گڑھ چل کر پھر سے پڑھائی شروع کروں۔ چنانچہ میں روزِ مقررہ علی گڑھ کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس زمانے میں آرزو پانچ حالی روڈ پر رہتے تھے۔ یہ مکان مولوی مشتاق حسین صاحب کو ملا ہوا تھا۔ اور اسی کے ایک حصے میں آرزو مقیم تھے۔ اسی میں خلیل الرحمٰن اعظمی بھی تھے۔ میں یہیں اترا اور آرزو کے ساتھ رہنے لگا۔ ان دنوں خلیل الرحمٰن اعظمی قسمت آزمائی کے سلسلے میں بمبئی گئے ہوئے تھے۔ دو چار روز کے بعد واپس ہوئے تو میری ان سے ملاقات ہوئی اور پھر یہ ملاقات اچھے اور گہرے تعلقات میں منتج ہوئی۔ مشتاق صاحب سے بھی بڑے گہرے تعلقات ہو گئے اور بعد میں کئی موقعوں پر میرے مددگار ثابت ہوئے۔ آرزو اور اعظمی کے کھانے کا انتظام انہیں کے یہاں تھا۔ میں تو آرزو کا مہمان تھا اور انہیں لوگوں کے ساتھ یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس مکان کے باہر تھوڑا سا میدان تھا اور شام کے وقت چند کرسیاں بچھا کر یہیں نشست ہوا کرتی تھی۔ یہ نشست بڑی دلچسپ اور دل کے لگانے کا اچھا خاصا ذریعہ تھی۔ یہیں بہت سارے لوگوں سے ملاقات ہوئی اور تعلقات ہو گئے۔ یہیں سے میں نے میٹرک کا امتحان دیا اور پھر پٹنہ واپس آ گیا۔ سیشن کے شروع میں پھر علی گڑھ گیا اور چار سال کے قیام کے دوران انٹر اور بی اے کیا۔ علی گڑھ کے یونیورسٹی کے یہ چار سال میرے لیے کئی لحاظ سے مفید ثابت ہوئے۔ میں نے اس یونیورسٹی کو اس کی تاریخ کو اور اس تاریخ کے پس منظر کو وہیں رہ کر سمجھنے میں بہت مدد ملی۔ یہاں آرزو اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی وجہ سے اونچے حلقے کے لوگوں سے جان پہچان بھی ہوئی اور ربط ضبط میں ہو گیا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی ایک عادت شاعر گری کی بھی تھی۔ وہ شاعر گڑھا کرتے تھے۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس وقت ان کی چاک پر ایک صاحب حنیف خان ناشاد تھے۔ ناشاد دربھنگہ یا مظفر پور کے رہنے والے تھے اور اس وقت کے اچھے موقر ادبی رسالوں میں ان کی غزلیں چھپتی تھیں۔ ایک موقع پر خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب نے یہ پیش کش مجھ سے بھی کی کہ آگرہ میں ایک مشاعرہ میں بھی چلیئے۔ میں نے کہا میں شاعر تو ہوں نہیں، میں جا کر کیا کروں گا؟ جواب میں انہوں نے کہا میرے پاس کئی غزلیں ہیں ان میں سے دو چار آپ رکھ لیجئے اور اس طرح انہوں نے مجھے بھی شاعر بنانے کی کوشش کی۔ ویسے ادب و شعر سے میرا بچپن سے تعلق تھا اور غزل میں بھی اچھی خاصی طبع آزمائی کی تھی۔ لیکن تمام کوششوں کے باوجود میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ زبردستی شاعری کوئی اچھی بات نہیں۔ پھر بھی مختلف موقعوں پر باطنی دباؤ کے تحت میں نے کچھ آزاد نظمیں کہیں۔ ویسی دو تین نظمیں میرے پاس وہاں بھی موجود تھیں اور انہیں خلیل صاحب کے حوالے کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ان نظموں کو دیکھئے اور ان میں کچھ بات ہو اور چھپنے کے لائق ہوں تو آپ جہاں چاہیں بھی دیجئے۔ دو نظمیں میری اپنی اور ناشاد کی کچھ غزلیں اپنی انہوں نے سنگ میل پیشاور کو بھیج دیا لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ سنگ میل بند ہو گیا اور مجھے نہیں معلوم کہ میری نظمیں اور ان غزلوں کا جو خلیل صاحب نے بھیجی تھیں ان کا کیا ہوا۔

میں نے یہاں انٹرمیڈیٹ میں اکنامکس، منطق اور پالیٹکل سائنس کے مضامین لے رکھا تھا۔ بی اے میں فلاسفی، پالیٹکل سائنس اور انگلش لٹریچر کے مضامین تھے۔ پڑھائی وڑھائی تو چیز کیا ہوتی، ذہن میں اس پورے دوران میں ایک اچھا اسٹوڈنٹ ہونے کی بات کبھی آئی ہی نہیں۔ زیادہ تر باہر کی کتابیں پڑھتا رہا اور اس طرح وقت گزرتا رہا۔ میں یہاں سر سید ہال کے ویسٹرن وِنگ میں تھا۔ یہاں میرے سینئر پارٹنر ایک صاحب مدھیہ پردیش کے تھے۔ بی اے میں مَیں اسی ہال کے ایسٹرن وِنگ میں چلا گیا اور یہاں کمرے میں مَیں سینئر پارٹنر کی حیثیت سے رہا۔ اس زمانے میں ایک عجیب بات دیکھنے میں آئی۔ نئے سیشن کے زمانے میں کئی اسٹوڈنٹ کشمیر سے آئے ہوئے تھے۔ نئے طلبا کو اپنے کمرے میں کوئی لینے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ میں شروع سے ایک مرنجاں مرنج آدمی رہا ہوں۔ یہاں بھی میں نے ان لوگوں کے کمرے میں آنے پر کوئی مزاحمت نہیں کی اور میرے ساتھ ان کے پورے سیشن میں بہت اچھے تعلقات رہے۔ ان میں سے جاڑوں میں ایک صاحب نے ایک کشمیری مسالہ تحفے میں دیا۔ اس کا تھوڑا حصہ توڑ کر گوشت میں ڈال کر استعمال ہوتا تھا۔ یہ بھی میرے لیے ایک عجیب تجربہ تھا۔ اس کے استعمال کے بعد سردیوں کے باوجود جسم میں کافی گرمی محسوس ہونے لگتی تھی۔ میری یہاں ہاسٹل کی زندگی بالکل خاموش زندگی تھی۔ سوائے پڑھنے کے کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔ شام کے وقت مشتاق صاحب کے یہاں پانچ بجے روز چلا جاتا تھا اور وہاں جو نشست ہوتی تھی اس میں میری شرکت مستقلاً ہوتی رہی۔ انٹر کے بعد حنیف خان ناشا گھر گئے تو پھر واپس نہ ہوئے۔ اس کے بعد خلیل صاحب بھی ایک دوسری جگہ منتقل ہو گئے اور ان کے ساتھ کنور محمد اخلاق الرحمٰن رہنے لگے۔ یہ بھی آہستہ آہستہ شعر و شاعری کے میدان میں قدم بڑھانے لگے اور بعد میں اردو ادب میں شہریار کے نام سے مشہور ہوئے اور جدید شاعروں میں ان کی ایک جگہ ہے۔

اسی حالی روڈ پر قیام کے زمانے میں خلیل صاحب نے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔ اس کا نام ''حالی روڈ ٹائمز'' رکھا گیا اور یہ دست بدست کچھ لوگوں تک پہنچتا رہا اور پھر گھوم گھام کر اپنی اشاعت کے مرکز میں لوٹ آتا تھا۔ یہ بہت چلا نہیں۔ اس میں کافی محنت کرنی پڑتی تھی اور جو وقت صرف ہوتا تھا چند دنوں کے بعد اس کا کچھ حاصل نظر نہیں آیا۔ یہ سلسلہ ختم ہو گیا لیکن ایک دوسرے صاحب سعد محمود الہاشمی جو رحم علی الہاشمی کے بیٹے تھے اور اس وقت کے طلبا میں کافی تیز طرار آدمی تھے انہوں نے اسی طرح کا ایک ہاتھ سے لکھ کر اخبار اپنے گھریلو حلقے میں چلاتے رہے۔ یہ اچھا خاصا دلچسپی کا سامان تھا۔ لیکن یہ بھی چند اشاعتوں کے بعد بند ہو گیا۔ بعد میں محمود الہاشمی آئی اے ایس کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور حکومت کی خدمت میں لگ گئے۔ ان کی زندگی نے وفا نہیں کیا اور بھری جوانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میں نے کسی اخبار میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی اور مجھے بڑا افسوس ہوا۔ میرے ایک عزیز سراج بھی اسی زمانے میں علی گڑھ میں سعد محمود مرحوم کے ساتھ تھے اور دونوں میں کافی گہرا تعلق تھا۔ سراج کے ہی واسطے سے کچھ میرے بھی تعلقات ہو گئے تھے۔ اسی علی گڑھ کے زمانے میں ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ میرے دوست مختار الدین آرزو نے ایک میرا ایک خاکہ لکھ کر ''علی گڑھ میگزین'' میں چھپوا دیا۔ اس خاکہ کی کوئی فنی حیثیت نہ تھی۔ اسے محض ایک ''پھلجھڑی'' کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس میں حقیقت کم اور بھرتی کی باتیں زیادہ تھیں۔

مَیں بی اے کے بعد پٹنہ چلا آیا۔

☆☆☆

ایک 'علیگ' باپ کا تحفہ

خاندانِ صادق پور کا ایک تیرہ سالہ جینئس شاعر

آپ نے کسی تیرہ چودہ سال کے لڑکے کی ایسی اعلیٰ شاعری کے نمونے اپنے زمانے میں شاید کہیں نہ دیکھے ہوں، جیسی ڈھلی منجھی، نکھری ہوئی زبان میں پختہ، پاکیزہ اور بلند فکر کے ساتھ، غضب کی شاعری خاندانِ صادق پور (پٹنہ) کے اس ٹوٹے ہوئے تارے اعجاز حسن نے کی، جو پٹنہ چھوڑ کے پڑوس کے آسمان پر اپنی لمحاتی چمک دکھا کر پونے چودھ سال کی کچی عمر ہی میں اپنے پیدا کرنے والے سے جاملا۔

ادب میں ایک غیر معمولی شعری مجموعے کا اضافہ ہوا ہے، ''نقشِ اعجاز'' کے نام سے احمد حسن صاحب (احمد حسن ایم اے، علیگ، ۲۶۳/۱ شریف آباد) نے اپنے مرحوم فرزند اعجاز حسن صادق پوری کی نظمیں (۱۹۸۱ء کے آخر میں) جانے والے کی آخری یادگار کے طور پر اس کے ہم وطنوں کو سوغات بھیجیں۔ خوبصورت کتابت وطباعت سے آراستہ ۱۰۴ صفحات پر پھیلا ہوا یہ مجموعۂ کلام ایسی قیمتی سوغات ہے جسے اچھی شاعری پسند کرنے والے مدتوں تک نہ بھلا سکیں گے۔

اعجاز کی نظموں کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

میں کچھ ہی کہوں، تم کچھ ہی کہو
یہ ہستی ایک پہیلی ہے
سب اپنی دھن میں گاتے ہیں
سب اپنی تان اڑاتے ہیں
کہتا ہے کوئی خواب ہے یہ
کہتا ہے کوئی بے آب ہے یہ
کچھ ایسے ہیں جن کی نظروں میں
اِک کیف ہے یہ، سرمستی ہے
میں کہتا ہوں دل ہی ہے دنیا
اور دل ہی حاصل ہستی ہے

•

کیسی بڑائی کیسی شان
اپنی حقیقت کو پہچان
چند دنوں کا ہے مہمان
کُلُّ مَن علیہا فان
دل پہ اٹھا مت بارِ الم
ہر لحظہ رہ خوش خرّم
کیوں کھاتا ہے جھوٹی قسم
لب پہ خدا اور دل میں صنم

•

جب تک سفر تھا جاری، منزل تھی دور مجھ سے، راحت تھی دور مجھ سے
لو ختم یہ سفر ہے، منزل قریب تر ہے، اب دائمی سفر ہے
جب تک سفر تھا جاری، وحشت تھی اور اداسی، تھا لمحہ لمحہ بھاری،
منزل تھی دور مجھ سے
اب ختم یہ سفر ہے، دل کتنا پرسکون ہے، وحشت نہ اب جنوں ہے
میں خوب جانتا ہوں، کیوں لوگ غمزدہ ہیں، ہر وقت کیوں دعا
ہے، اب میں ہوں اور خدا ہے

•

پھر دھوپ میں ہے نرمی، پھر آج فضا گھر کی، خوشبو سے معطر
ہے، کیا خوب یہ منظر ہے
پھر ایک حسین تتلی، بر دوش صبا آئی، بیلوں، چنبیلیوں پہ لہراتی
ہوئی آئی
پروردۂ قدرت ہے، شہکار صباحت ہے
رنگین قبا پہنے، زریں عبا پہنے
کیا شوخ سی پھرتی ہے، ہر پھول پہ گرتی ہے
اس گلشن عالم میں، دل بھی ہے مرا تتلی
آئے گی خزاں جس دم، یہ پھول نہ یہ تتلی
دو دن کی خوشی ہے یہ
دو دن کی یہ ہستی ہے
تجھ کو بھی فنا آخر
مجھ کو بھی فنا آخر

•

کوئی عنواں بھی لکھوں تو کیا لکھوں
بے سروپا ہے حیات مختصر
سوچتا ہوں اس کو آخر کیا لکھوں
زندگی ہے اک غبار رہگزر
سایۂ غول بیابانی ہے یہ
وحشت ایام صحرا سربسر
فیل بے زنجیر، شتر بے مہار
دامِ گیسوئے شبِ وحشت اثر
ایک نغمہ جس میں کوئی سُر نہ تال
ایک بے معنی سی تحریر وسطر
پھڑ پھڑانے سے بھی جو محروم ہو
میں ہوں ایسا طائر بے بال وپر

اس کے پیچھے بھاگتا پھرتا ہوں میں
ہوتی جاتی ہے یہ مجھ سے دور تر
تو کسی سے بھی وفا کرتی نہیں
کوئی تجھ کو لاکھ چاہے عمر بھر
زندگی پھر بھی ہیں سب تیرے اسیر
ہو سکے جتنا بھی تجھ سے، ناز کر

•

جو ہے یقین وہ بھی، اک وہم ہے گماں ہے
ہر نقش نقش باطل، ہر شے دھواں دھواں ہے
مت بھول اس جہاں میں ہر لحہ امتحاں ہے
سب ہیں نشاں اسی کے جو آپ بے نشاں ہے
کیا اعتبارِ ہستی!
جو دم ہے ارمغاں ہے!!
اعجاز پاک دل ہی، مقصود دو جہاں ہے!!!

•

مصورِ جہاں بتا، تری مصوری کا میں، نہیں ہوں شاہکار کیا؟
کہاں ہے میری شکل کا؟
کہیں نہیں، کہیں نہیں!
یہ بات ابھی ہے راز کی، ہے مقصد حیات کیا، ہے مقصد وجود
کیا؟
قیود ہست وبود کیا، نیاز وناز کے، یہ غائب وشہود کیا؟
یہ راز کیسے فاش ہو، خلش جو بن کے ہے نہاں، مرے حریم
ذات میں!!

•

یہ جو مہلت بھی ہے، اس کو کچھ غنیمت جان تو، اس دارِ فانی میں
گلوں کی طرح
تو بھی خاک میں ملنے سے پہلے/ اپنے اخلاقِ حمیدہ سے/ فروغِ
حسنِ عالم کا کوئی سامان کرتا جا!!
شبستانوں میں آویزاں تھے جن کے اطلس وکمخواب کے
پردے
منور جن کے ایوان، شمع کافوری سے رہتے تھے
سو، اب لا بن کے پھرتی ہیں ہوا میں صورتیں ان کی
ہوا کی سنسناہٹ داستان ان کی سناتی ہے
تو پھر ہم نوگرفتہ/ ایسے اس انجام ہستی پر، نوا سنج فغاں کیوں
ہوں!

جہاں تک ہوسکے ہم سے
کچھ ایسا کام کرگزریں
کہ اس مہماں سرا میں جو بھی آئے/ اسے تسکین و راحت کا تو
کچھ ساماں میسر ہو!

•

نظموں کے ان اقتباسات میں موت، ہمہ وقت، ہمہ جا چھائی ہوئی موت کا خیال مشترک اور لازمی عنصر کے طور سے چھایا ہوا ہے۔لیکن یہاں یہ بزدل بنانے والا، یا بےعمل کرنے والا خیال نہیں ہے۔ بڑا جاندار، فعال اور زندگی کو نوری بنانے والا خیال ہے۔بس یہی کہ اچھے انسان کو ہمیشہ یہ خیال رہنا چاہئے کہ وہ یہاں ابدالآباد تک رہ پڑنے کا ٹھیکہ لے کر نہیں آیا، اگلے کیا رہے جو ہم رہیں گے! تو اس مہماں سرائے میں ''بارے کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو''۔

احمد حسن (اشک) **معاصرِ** (قدیم) کا ایک اہم نام رہا ہے۔اگر ان کے بیٹے اعجاز حسن زندہ ہوتے تو اس کلام کو شمس تبریز اور رومی کا ''من تو شدم تو من شدی''، سمجھا جاتا۔اس لیے اب، کہ نہ یہ رہے نہ وہ رہے، نہ احمد حسن صاحب، نہ ان کے فرزند، معاصر میں شائع شدہ ۱۹۴۶عیسوی کی، احمد حسن صاحب کی ایک نظم درج کرنا، نامناسب نہ ہوگا، اس سے کچھ سراغ **رومی** کا ملے گا کچھ ان کے **شمس تبریز** کا! احمد حسن صاحب کی مذکورہ نظم ملاحظہ ہو:

اے سیلِ رواں!

(مجھے بھی سیل رواں ساتھ تیرے جانا ہے
ٹھہر! ٹھہر، ہے اسی سمت کو دیارِ حبیب)
اے سیل رواں رُک جا
دم بھر کے لیے رُک جا
جاناں ہے کہاں تجھ کو/کس دھن میں رواں ہے تو؟
بے تابی فرقت ہے
ہر لحظہ عیاں تیری
میں خوب سمجھتا ہوں
منزل ہے کہاں تیری
گو سینۂ گیتی میں اِک رازِ نہاں ہے تو!
اے پیکر بے تابی!
اے خوگر بے تابی!
میں خود بھی تڑپتا ہوں سن سن کے فغاں تیری!
اک جذبۂ الفت ہے!
موجوں کا طلاطم کیا؟
اک سوز محبت ہے!
پانی کا ترنم کیا؟

☆☆☆

علیگ عزیزوں کے خط

From: Alig Brotherhood

Diaspora encapsulates the people and movements that helps shape the modern Indian Muslim, especially those who came under the spell of Sir Syed and his associates. The first and second generations of Aligarh helped bring a revolution in modern education of Muslims on the subcontinent. Many of them were literary luminaries and freedom fighters too. The Aligarh Diaspora commemorates many of those giants who passed out of the great institution Sir Syed established.

Mohammed Wajihuddin (Mumbai)

I found your letter on the FB and it immediately clicked perhaps we were together at Aligarh Muslim University, VMHall. I had joined university in 1954-55 at intermediate level and did my Msc , Physics , 1963

I was residing in VM Hall, Nasrullah hostel. Anyway, please let me know if we know each other. I live in Dubai!

Asad Murtaza, Tel: 0097150-6251379

I read your Aligarh Diaspora-5,it's wonderful.

Prof. Dr. Alay Ahmad

Thank you for including the poster of Darbar -e- Syed in Aligarh Diaspora 4.?

I have created a page on blogspot.com for Aligarh Diaspora issues.?

https://aligarhdiaspora.blogspot.com.

All 4 issues are placed on this page.?

If you share the original images instead of PDF, I can put them on this page in the ?future too. This way, it will be easily accessible from a single place.?

Afzal Usmani (Washington DC)

I was delighted to receive your email. Opened the attachment immediately and read it. Article about Syed Hashim Ali Akhtar is very well written. Not only it describes his personality but also gives a glimpse of culture, university politics and environment of that time.

I also liked "Sufism: Its origin and development". Article written in 1926 is very informative. One thing I noticed that people may debate about that in the third century Hijri, Islam reached its zenith. Different people have different views about the subject, and it all depends upon the criteria one chooses.

Naeem Syed (USA)

I am really impressed and influenced with your true initiative and encouragement through the platform of 'Aligarh Diaspora'. Indeed, it is a great source of inspiration, an optimistic learning opportunity for every reader and furthermore to flourish the various aspects and manifolds of Aligarh Muslim University, its history, civilisation and finally, the divine, glowing, shining and immortal Sir Syed Ahmad Khan. In addition, I am really pleased to see remarkably, beautifully and precisely presented an introduction of my father, his articles, life time work as well as myself. Consequently, your excellent support will further enhance and enlighten my ability to publish remaining writings of Shah Hasan Ata (Alig) in more appropriate and effective manners. Hopefully, my email will find peace and harmony at your side.

Shah Umer Ata (UK)

علی گڑھ ڈائسپورہ کے شمارے پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں اور نئی معلومات کو یادوں کے خانہ میں جمع کرتے ہیں۔

محمد طارق غازی، وھٹبی۔اونٹاریو۔کینڈا

اتوار۱۳فروری ۲۰۲۲

علیگڑھ ڈائسپورہ کے چار نمبر موصول ہوئے۔آپ کا بےحد مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے یہ شمارے ارسال کیے۔تمام مضامین بیحد معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔علیگڑھ کی یادیں تازہ ہوگئیں۔علیگڑھ پائندہ باد۔

پروفیسر حافظ شائق احمد یحیٰی۔(نیوجرسی، امریکہ)۔

علیگڑھ ڈائسپورہ – ٦ میں قیوم قائد صاحب پر مختار الدین آرزو صاحب کا مضمون میرے لئے خاص دلچسپی کا ہے. دونوں ہی میرے والد مرحوم قیوم اثر کے دوستوں میں تھے اور جب سے ہوش سنبھالا ان دونوں کا ذکران سے سنتا رہا ہوں۔

شاہین نظر

بہت بہت شکریہ جناب. اقبال صاحب کے سوانحی تاثرات کے بعد سیدین صاحب کا ایک مختصر خودنوشت خاکہ آپ کی قوت ارادی کی گواہی دیتا ھے۔

جہاں تک میرا سوال ھے مجھے لگتا ھے کہ اچھی خودنوشت نہ فرمائشی ہوسکتی ہے اور نہ ہی ہم عصروں پر تبصرے کے بغیر مکمل ہوسکتی ھے،تبصرہ اور تنقید قرابت دارھیں. شائع کیجئے اور زندہ ھم عصروں اور مرحومین کے لواحقین سے ناراضگی کا طوق گلے میں ڈالیئے ۔

بہرحال اگر کچھ نکل کر آیا تو آپ کی خدمت میں ضرور پیش کروں گا۔

نوید مسعود

Aligarh Diaspora - 8

Launched to mark the Finalé (December 2021) of AMU Centenary Celebrations 2020-21

THE ARABIAN APOSTLE

by Prof. Mohammad Habeeb
ex. Professor of History AMU, Aligarh

Dark as was the condition of the world in the sixth century of the Christian era, the light of morning was also near. The efforts of countless generations and a series of progressive revelations had at last prepared mankind for the final message. On the 9th of Rabiul Awwal[1] (20 April 571 A.D.) the Arabian Apostle was born at Mecca to herald in the last and the greatest revolution in the religious consciousness of mankind—a revolution based on the conception of human equality and brotherhood and the worship of the one and the unseen God, in which the teachings of Abraham and Moses and Christ were to find their rational consummation. The biographers of the Apostle declare in their symbolic language that fourteen towers of the Persian Emperor's palace fell down on that day while the fire of famous Zoroastrian temple was mysteriously put out, and the bed of the river Sawa dried up all of a sudden.[2] But what really fell was the power of the Magian priesthood, whose mysterious ceremonies and want of faith could no longer bolster up a tottering throne, and a formal and sect-ridden Christianity, which for several generations had deluged Asia Minor with blood; and with them, as the vivifying breeze of monotheism blew over the landscape, bringing peace and strength and joy to the hearts of men, there disappeared many horrid cults and degrading beliefs, which had been hanging over the minds of their votaries like a thick and pestilential fog. 'Islam'—resignation to the Divine Will and a superb, haughty contempt for the powers of evil—was the spirit of the new faith. Out of the embers of three decaying civilizations, there was fashioned a new social order of terrific strength, with the hope of eternity throbbing in its bosom and the light of morning sparkling in its eyes.

In order to preserve the eloquence and the traditions of the desert, which they so highly prized, the nobles of the Arabian cities had established the custom of sending their children soon after their birth to be nursed by women of the Bedouin villages.[3] For two or three days after his birth the Apostle to whom the name Mohammed was given by his grand-father, Abdul Muttalib, was nursed by his mother and then by Sawibah, a slave-girl of Abu Lahab. Soon after a number of women from the tribe of Hawazin came to Mecca to procure some children of the aristocracy to nurse, and from amongst them, the Apostle was assigned to Halima Sa'diya. That lady was at first reluctant to accept an orphan boy but as she was unable to find any one else, she consented to keep him.[4] The young child found a congenial home in the family of his foster-mother and always retained the warmest affection for her and all her family. When Halima came to see him during the Apostolic period, he ran up to embrace her with the words "My mother! My mother!" on his lips. His foster-father, Haris, also came to see him. "What is this you preach?" he asked. "The day will come", the Apostle replied, "when I will prove to you the truth of my assertions!" Halima[5] and Haris joined the new faith with their son Abdullah and their daughter Hazaqah, generally known as Shima, but unfortunately nothing is known of the Apostle's two remaining foster-sisters, Anisah and Hazaqah. After he had been with her for two years, Halima brought the Apostle to Mecca, but as a plague was raging there, Amina asked her to take him back again. At the age of six he was finally returned to his mother.[6] Judging from the Apostle's later opinion, the experiment had proved a success. "I am more eloquent than others", he used to say, "because I combine the blood of the Quraish with the dialect of the Hawazin."[7]

In the same year, it would seem, Amina took her son to Medina on a visit to her husband's tomb,[8] but during her return journey after a month she died at Abwaih and the Apostle was brought back to Mecca by a woman-servant, Ummi Aimen. Young though he was, the Apostle remembered many incidents of this short sojourn at the scene of his future activities. "This is the house in which my mother stayed", he remarked to his companions once when they were passing through the settlement of Banu Adi, "In this pond I learnt swimming and here, on this plain, I used to play about with a girl, named Anisah!" His grand-father, Abdul Muttalib, became his guardian after his mother's death, but two years later Abdul Muttalib also died at the patriarchal age of eighty-two, and his weeping grandson accompanied the funeral procession to the grave.[9] The sad event suddenly changed the balance of influence and power in favour of the Umayyads, whose leader, Harb, succeeded to Abdul Muttalib's position, excepting, the office of *Saqqab* (giving water to pilgrims), held by the Apostle's youngest uncle, Abbas, no other dignity remained in the hands of the Hashimites.

Of the ten sons of Abdul Muttalib, Abu Talib and Abdullah were children of the same mother, and Abdul Muttalib before his death had assigned the Apostle to Abu Talib's care. The latter looked after the son of his deceased brother with an affection and tenderness that left nothing to be desired and loved him more than his own sons. The young boy wandered about the desert looking after his uncle's goats and eating berries with a freedom and happiness he loved to recall in later life. When he had reached the age of twelve, Abu Talib started for one of his trading journeys to Syria. He was reluctant to take his nephew with him on such an arduous venture, but the latter clung to him and would not be denied. Abu Talib had to yield. On reaching Basra, uncle and nephew lodged with a Christian monk, named Bahira, an incident which has drawn the attention of Christian as well as Muslim writers. This is the leader of the Apostles, the monk is said to have remarked as soon as he saw Abu Talib's nephew. "Why?", the monk stated that he had actually seen the trees and stones bow to the Apostle as he descended down the hill. The story, however, rests on a tradition the authority of which is very questionable.[10]

Some time after the Apostle's return, the 'sacrilegious war'[11] broke out between the tribes of Quraish and Qais. Both tribes assembled all their families but the Quraish led by Harb defeated their opponents. The Apostle was present on the field by the side of his family and kindred, but he refrained from raising his hands against the enemy. "Apart from the fact", Imam Suhaili remarks, "that the war was waged in the sacred months, the strife was one between heathens and heathens and a Mussalman is not allowed to fight except for the glory of Allah." The war was followed by a fact, known as the *Hilful Fuzul*[12] by which the leaders of the Quraish swore to defend the helpless and to exclude tyrants from Mecca. Nothing came of the pact, but the Apostle who was one of the signatories, often declared in later life that he would have preferred it to 'red camels.'

He was soon called upon to render a more distinguished service. The sacred building of the Ka'ba was then a mere enclosure and the wall surrounding it was not more than a man's height. Moreover as it was situated in a depression, the rainwater of the city flowed into it and a dam, that had been constructed to keep it off, often broke down owing to the impetuosity of the torrent. It was, therefore, decided to pull down the building and construct it again on stronger foundations. Walid bin Mughira purchased on behalf of the Quraish the planks of a merchant-ship that had foundered off the coast of Jeddah and brought it to Mecca with a Roman mason, Baquen. The parts of the sacred building were apportioned between various families and the work went on amicably enough till the question, who was to lay the sacred black stone, nearly led to bloodshed. Everyone was anxious to have the honour for himself. For four days a bitter strife raged and some of the claimants with characteristic Arab impetuosity dipped their hands in cup of blood to signify their resolution to win or die. On the fifth day Umaitha bin Mughira, the oldest of the Quraish, suggested a compromise. They were to accept as their arbiter the man who first entered the holy ground next. This was agreed upon and as a happy chance would have it, the person who came first was the Apostle himself. He performed his delicate duty to the satisfaction of all parties. After placing the stone in the centre of a sheet, he asked Quraish chiefs to catch hold of the corners, and after it had been raised to the required height, he placed it in the wall with his own hands. It was a symbolic act: "I am the last stone of the Apostolic edifice." The sacred building was completed and roofed.[13]

For centuries before the rise of Islam the Arabs had been a nation of traders. The Apostle's uncle, Abu Talib, was a merchant and he also took to the same profession when he attained the age of discretion and wanted a means of livelihood. He was clear, honest, straight-forward and soon won the good-will of those who had to deal with him. They felt they could rely on his word and deed, and loved to call him the 'honest merchant'. Abdullah bin Abil

Hamasa, one of the Apostle's companions in days to come, relates a curious incident: "I was making some business arrangement with the Apostle when I took leave and promised to return immediately. But somehow the promise slipped out of my mind, and when on recollecting it after three days I hurried to the spot, the Apostle was still standing there. 'You have put me to much inconvenience', he said without the slightest indication of displeasure on his brow, 'I have been waiting for you here all this time.'"[14] In those days persons who could not themselves cart their stock from market to market generally entrusted their belongings to professional traders and paid the latter a part of the profit in compensation for their pains. Such a partnership with the Apostle was eagerly sought, for he was absolutely clean in his business dealings and scrupulously considerate of the rights and claims of others. Trading meant travelling and Apostle saw a good deal of the Arabian world in the course of his journeys.[15] Apart from Syria, which he had visited with his uncle, it has been proved that he twice visited Jarsh in Yemen; and when, during the Apostolic period the ambassadors of Bahrain came to see him, he told them that he had travelled extensively in their country.[16]

When he was about twenty-five, the Apostle's business dealings brought him into touch with a distant cousin[17] of his, a widowed lady of forty, named Khadija. She was so rich that when the *carawans* marched out of Mecca, her stock alone was more than that of all the rest. She had two sons and a daughter by two previous husbands, and her chaste life had won for her the nickname of 'Tahira' or the Pure. Attracted by the Apostle's honest and straightforward character, she commissioned him to take her goods to Basra and promised to pay him a higher share of the profits than he got from others. Three months after his return, she sent him a proposal of marriage. Though Khadija's father was dead, her uncle was still alive, but with an Arab woman's innate love for freedom, she preferred to settle the matter on her own initiative.[18] The Apostle having consented to the proposal, the nobles of the Quraish assembled at Khadija's house on the appointed day and Abu Talib recited the marriage sermon. The *mihr* (marriage settlement) was fixed at five hundred *dirhams* of gold. The union proved to be a very happy one.[19]

Among the Arabs idol worship was the order of the day, and the monotheism of Abraham had been almost forgotten. "The gods were many. They were the patrons of septs and tribes, and symbolized, so to speak, the holy unity which united the present and past members of these. Above them all stood Allah, the highest and universal God. By Him the holiest oaths were sworn; in His name treaties and covenants were sealed; the lower gods were not fit to be invoked in such cases as they belonged to one party instead of standing over both. But since Allah ruled over all and imposed duties on all, it was not thought that one could enter into special relations with Him. In worship He had the last place, those gods being preferred who represented the interest of a specific circle, and fulfilled the private desires of their worshippers. Neither the fear of Allah nor reverence for the gods had much influence. The disposition of the heathen Arabs, if it is at all truly reflected in their poetry, was profane to an unsual degree. Their motives to noble deeds are honour and family feelings; they hardly name the gods, much less feel any need of them. There is nothing mystical in these hard, clear and yet so passionate natures."[20] Three hundred and sixty idols had been placed in the Ka'ba, and the Quraish, who prided themselves in being its guardians, placed before the pilgrims the option of dressing like the Quraish or remaining nude while going round the Ka'ba. Most of the pilgrims, we are told, preferred the alternative, and the holy ceremony was performed in a condition of nudeness.

Even before the advent of the Apostle there were minds thoughtful enough to revolt against this senseless heathenism. Of these dissenters Ubaidullah bin Jahsh, Warqa bin Naufal, Usman binul Hawaris and Zaid bin Amr bin Nafil are best known. Warqa and Usman accepted Christianity, while Zaid died with a pathetic regret on his lips: "O Lord! I would have worshipped Thee in the true form, had I but known it." The Apostle is known to have met Zaid some time or other.[21] Warqa was his wife's cousin, and, according to one tradition, an intimate friend also. He is also said to have been present at a sermon of Qas bin Sa'dah at Ukaz, but this is doubtful.[22]

The Apostle's own attitude towards idolatry was one of uncompromising negations throughout. Even in his childhood he congratulated himself on the good fortune that an accident had prevented him from joining a meeting where old stories were related. He refused to eat the fresh of animals sacrificed to idols and tried to induce his personal friends to refrain from worshipping them. A neighbour once heard a conversation between him and his wife. "By Allah, Khadija", the Apostle was saying, "I will never worship Laat or 'Uzza." "Well, then", Khadija replied, "cast aside Laat and cast aside 'Uzza." It speaks much for the happiness of his married life that his wife should have been his first convert.[23] His personal friends of those days were remarkable for the purity of their lives. The chief of them, Abu Bakr, occupies a unique position in the history of Islam. The Apostle was also on intimate terms with Khadija's cousin, Hakim bin Hizam, one of the greatest Quraish nobles and the proprietor of the *Darun Nadva*. Hizam was not converted to Islam till the eighth year of the Flight, but religious differences did not interfere with his affection for the Apostle. He once presented himself at Medina with a cloak worth fifty gold pieces, which he had purchased as a present for the Apostle. "I cannot accept a present from an idolator", the latter replied, "but I shall take it if you will consent to accept the price." Hizam had perforce to take the money. In his later years Hizam sold the Darun Nadva to Amir Mu'awiya for a hundred thousand *dirhams* and distributed the money in charity.[24] Another member of the circle was Zamad bin Sa'lhah, a physician. Tradition records that on returning to Mecca after a long absence, Zamad saw the Apostle in a street followed by a mob of hooting children. As his enemies had spread the rumour that the Apostle was mad, Zamad approached him with the assurance: "Mohammed! I can cure people of insanity!" The latter, however, replied in brief and trenchant words which converted Zamad to Islam on the spot.[25]

Happily married to a lady of considerable wealth, and immersed, to outward view, in business affairs which often entailed long journeys, the Apostle's inner thoughts were concentrated on questions far different from those of barter and sale. "This deep-hearted son of the Wilderness, with his beaming black eyes and open social deep soul", Carlyle says, "has other thoughts in him than ambition. A silent, great soul; he was one of those who cannot *but* be in earnest; whom Nature herself has appointed to be sincere. While others walked in formulas and hearsays, contented enough to dwell there, this man could not screw himself in formulas; he was alone with his own soul and the reality of things. The great Mystery of Existence, as I said, glared-in upon him, with its terrors, with its splendours; no hearsays could hide that unspeakable fact, 'Here am I!' Such *sincerity*, as we named it, has in very truth something of divine. The word of such a man is a Voice direct from Nature's own Heart. Men do and must listen to that as to nothing else—all else is wind in comparison. From of old, a thousand thoughts in his pilgrimages and wanderings, had been in this man: What am I? What *is* the unfathomable thing I live in, which men name Universe? What is life; what is Death? What am I to believe? What am I to do? The grim rocks of Mount Hira, of Mount Sinai, the stern sandy solitudes answered not. The great Heaven rolling silent overhead, with its blue glancing stars, answered not. There was no answer. The man's own soul, and what of God's inspiration dwelt therein had to answer! . . . The jargon of argumentative Greek Sects, vague traditions of Jews, the stupid routine of Arab Idolatry: there was no answer in these . . . Use and wont, respectable hearsay, respectable formula: all these are good or are not good. There is something behind and beyond all these, which all these must correspond with, be the image of, or they are—*Idolatries;* 'bits of black wood pretending to be God'; to the earnest soul a mockery and abomination. Idolatries never so gilded, waited on by the heads of the Koreish, will do nothing for this man. Though all men walk by them, what good is it? The great Reality stands glaring there upon *him*. He there has to answer it, or perish miserably. Now, even now, or else through all eternity never. Answer it; *thou* must find an answer—Ambition. What could all Arabia do for this man; with the crown of Greek Heraclius, of Persian Chosroes, and all crowns in the Earth—what could they all do for him? It was not of the Earth he wanted to hear tell; it was of the Heaven above and the Earth beneath..." *(On Heroes, Hero-worship and the Heroic in History, pp.54-55)*

Three miles from Mecca was a cave known as Hira, the declivities of a mount of the same name. Thither the Apostle often retired for weeks and months together, and only came home to take back a fresh supply of provisions. What was his 'prayer' in these long and lonely sojourns? 'Meditation and thoughtfulness', says the commentary on Bukhari; but perhaps the real movement of the Apostle's thought was not unlike the arguments of the Apostle's thought that had convinced Abraham in days of old.

"And thus did we show Abraham the Kingdom of heaven and earth, so that he may be among the faithful.

"When the darkness of night enveloped him, he saw a star, 'Is this my Lord?' he asked. But when it had set, he remarked: 'I do not like the setting ones.'

"Next when the moon arose, he asked: 'Is this my Lord?' but when it had set, he again remarked, 'If my Lord had not led me right, I should have been among the erring people.'

"Lastly, he saw the sun rising and asked: 'Is this my Lord? Is this the greatest?' But when it had also set, he declared: 'O people! I will not bow to those you set up (with Allah). I have turned myself exclusively to Him who has originated the heavens and the earth, and I am not among the polytheists.'

"And his people disputed with him. 'Do you dispute with me about Allah, who has guided me on the right path', he answered, 'I fear nothing from those (gods) you set up besides Allah, unless it pleases my Lord. All things are comprehended in His knowledge. Why do not think of it?" (The Quran, chapter VI, 9).

They were years of silent and thoughtful preparation for his destined mission in life. He had been musing, reflecting and meditating constantly but it was not till the age of forty that the first revelation was vouchsafed to him.

***

Courtesy : Prof. Parvaiz Talib
First appeared in Jubilee Number of the Aligarh Magazine, 1925

Refrences (for the article "The Arabian Apostle):

1. Scholars have differed as to the date of the Apostle's birth, but it is agreed on all hands that the month was Rabiul Awwal and the day was a Monday and that the date was between the 8th and the 12th. Now the second Monday of Rabiul Awwal fell on the 9th, which must therefore be accepted as the date of the Apostle's birth. The question has been well discussed in a pamphlet by the Egyptian scholar, Mahmud Pasha Falaki.

2. This tradition is very popular, but, as the author has proved elsewhere, its authenticity is questionable.

3. Even after the Umayyad dynasty had been established at Damascus, the custom continued and princes of the royal house were assigned to Bedouin women to be brought up in the atmosphere of the desert.

4. Sahli declared that the profession of a paid nurse was not considered respectable and Halima's family only undertook it owing to a severe famine that year. But such aristocratic ideas must have been confined to the noble families of the cities because we regularly hear of Bedouin women coming to the cities every year to procure children from the rich families.

5. Ibn-i Kasir says that Halima died before the Apostolic era, but this is incorrect. The fact of her conversion is stated in the *Tarikh-i Ibn-i Khasemah*, the *Hoda-i Ibn-i Jauzi* and the *Muktasar Sunan Abi Daud* of Manzi. Hafiz Mughlatai wrote a special treatise on the subject (*Zarqani*, Vol. I, p. 170). For the conversion of Haris, see *Asabah fi Ahwalis Sehabah*, published by the Matbai Sa'adat, Egypt, Vol. I, p. 292.

6. There is difference of opinion as to the Apostle's age at the time, Ibn Ishaq gives it as six years.

7. *Tabaqat-i Ibn-i Sa'd*, Vol. I, p. 71.

8. This appears to have been the real object of the journey. Abdul Muttalib's mother belonged to the Najjar tribe of Medina, but this distant relation could hardly have induced Amina to undertake such a long journey.

9. Abdul Muttalib was buried at Hajwan. Dr. Margoliouth (*Mohammed*, pp. 45 to 49) accuses Abdul Muttalib of not keeping his grandson well. The statement is based on a tradition of Bukhari. In days when wine was still permitted to Muslims, Abbas killed a camel belonging to Ali in a fit of drunkenness and fried its heart and liver; and when the Apostle went to protest against the act, Abbas ventured to call him "My father's slave". But words spoken in anger and intoxication can hardly be considered as scientific evidence.

10. Sir William Muir, Draper, Margoliouth and other Oriental writers look on the Bahira incident as a compliment to Christianity and would have us believe that the teachings of Bahira were the real source of Islam. But apart from the impossibility of initiating a boy of twelve into all mysteries of faith, the tradition, if it is to be accepted at all, must be accepted in the form in which it has come down to us. It says nothing about Bahira instructing the Apostle in anything whatsoever.

The tradition itself is declared by Tirmizi to be "weak and improbable" (*Hasan wa gharib*). One of its narrators, Abdur Rahman bin Ghazwan, is declared by some eminent scholars to be unacceptable. "Abdur Rahman often narrates incorrect traditions", Zahabi says in the *Mizanul I'tidal*, "and the most incorrect of them is the story of Bahira." The same critic after quoting Hakim's statement that the Bahira tradition comes up to the standard of evidence required by Muslim and Bukhari declares that in his opinion several parts of the Bahira story are manufactured lies (*Talkhisul Mustadrak*). See also *Asabah* by Abdur Rahman bin Ghazwan. Bilal and Abu Bakr are said to have accompanied the Apostle, but Abu Bakr was very young then and Bilal was altogether non-existent; on this ground Hafiz Ibn-i Hajar considers some parts of the tradition unacceptable and declares that Abdur Rahman bin Ghazwan was often guilty of error. Lastly, the chain of narration is altogether incomplete and we are nowhere told as to the contemporary eye-witness on whose authority the tradition is based. It must be, therefore, rejected.

11. Because waged in the sacred months.

12. So named after its first signatories. *Tabaqat*, Vol. I, p. 82.

13. For want of sufficient building material, the new building did not cover the whole of the old enclosure, and a part of it was perforce left out. This is now known as Hatim. A wall was drawn round it to mark its outline and after the entry into Mecca the Apostle wished to pull down the building and construct it afresh so as to cover the whole of the old sacred ground. But he refrained from doing so lest the feelings of the new converts should be disturbed. For the facts of the above paragraph, see Ibn-i Hisham, Tabari and Zarqani, Vol. I, pp. 232-40 and Bukhari.

PS-9

14. *Sunan-i Abi Daud*, Vol. II, p. 236.

15. The Apostle may have seen the Persian Gulf at Bahrain and the Red Sea in his journey, but no value, in my opinion, can be attached to Dr. Margoliouth's conjecture that he must have been on a sea-voyage because the descriptions of sea and storm in Quran have the vividness of a personal experience. Neither does the evidence before us prove that he ever visited Egypt.

16. *Musnad Imam Hanbal*, p. 206.

17. The Apostle and Khadija had the same ancestor in the fifth generation.

18. It is stated by some traditionists that Khadija's father was drunk at the time of her marriage but protested against the inequality of the marriage when his sobriety returned. This is, however, incorrect and Suhaili has conclusively proved that Khadija's father had died before the Unholy War.

19. The facts appertaining to the Apostle's marriage will be found with more or less detail in Ibn-i Hishman, Ibn-i Sa'd and Tabari. For an exhaustive treatment see Zarqani, Vol. I, pp. 232-236. I have selected from these accounts the traditions that appeared to me most certain.

20. Wellhausen, *Encyclopaedia Britannica* ('Mohammedanism').

21. Bukhari.

22. Qas's sermon has been quoted by many works on literature and as it consists of short and rhyming sentences, European critics have imagined it to be the model of the Quran. The tradition will also be found in various forms in Baghwi, Azdi, Baihaqi, Jahiz, etc. but it is purely an invention and most of its narrators are not only unreliable but downright liars. The question has been discussed by Suyuti in his *Mauza'at* as well as the Allama Zahabi, Hafiz Ibn-i Hajar and others. Though the tradition is traced through various series of narrators, who are credited with inventing false traditions, Mohammad bin Hajjaj, a narrator common to many series, is declared by Ibn-i Mu'in to be a 'villain and a liar' while Ibn-i 'Adi credits him with inventing the false tradition of Harisa. Concerning Said bin Habira, who is responsible for another series, Ibn-i Haban states that "he attributed false to truthful people and either invented false traditions or else got other people to invent them for him". Qasim bin Abdullah and Ahmad bin Sa'd, who are responsible for another series, are notorious for their false tradition. Baihaqi quotes a long story about the traditions in which Abu Bakr quotes the whole sermon of Qas bin Sa'dah from memory. But, as Hafiz Ibn-i Hajar has proved, it is a pure invention. For a further discussion, see *Tafsilul Laaliul Masna'ah*, printed in Cairo, pp. 95-100.

In the time of the Umayyad and Abbasid caliphs a curious custom had been evolved. Contemporary men of letters were asked to compose sermons and verses, which were intentionally attributed to pre-Islamic or early Muslim heroes. Mohammad bin Ishaq bin Yasar, whom Imam Bukhari considered to be reliable enough for a tradition in *Juzul Qara-at*, was in the habit of asking contemporary poets to write verses on the Apostle's wars which he later on included in his work (Allama Zahabi, *Mizanul Itidal*, p. 92). Ibn-i Hisham has attributed hundreds of verses to Khadija, Abu Talib, Abu Bakr and others the language of which clearly shows them to be later fabrications, and even Ibn-i Hisham often confesses that "many literary critics consider them to be spurious". The obvious motive was a glorification of Islam, either the advent of the Apostle was foretold or it was attempted to supply evidence for some event of his life. Thus the sermon of Qas bin Sa'dah contains the lines: "Welcome to the Apostle, whose advent is near. He shall lead aright those who follow him and those who resist and oppose him shall be doomed to perdition." Often the Quran itself was taken as a model for these later-day compositions. Professor Margoliouth himself testified to this fact (Mohammad, pp. 27-63). A comparative study of the changes the Arabic language has undergone will easily enable the critic to discern the time of their composition, but it is curious to find that European writers should have mistaken these spurious verses of the Umayyad and the Abbasid period for the pre-Islamic compositions in imitation of which they pretend the Quran was composed.

23. *Musnad Imam Hanbal*, Vol. IV, p. 22. Lab and 'Uzza were idols of the Quraish. Dr. Margoliouth's assertion that the Apostle used to worship Lab and 'Uzza before going to bed is based on a hopelessly incorrect and inconsistent interpretation of the text of this tradition. The statement that they (the Quraish) used to worship (Kanu) idols is wrongly attributed to the Apostle. The same writer also declares that the Apostle sacrificed a goat to 'Uzza but quotes no authority for it except Wellhausen. There is a statement to this effect in *Mujamul Baladan* a treatise on geography but apart from the fact that such a work can lay no claim to being an authority on tradition, the particular story is due to the invention of Kalbi, a notorious liar. Christian writers, who wish to prove that the Apostle conformed to the practices of idolatry, are fond of referring to a tradition in the *Tarikh-i Saghir* that the Apostle had a son, named Abdul 'Uzza (creature of 'Uzza). Even if the tradition was correct, it would prove nothing more than that Khadija, who worshipped idols before her conversion, gave this name to her son and the Apostle merely tolerated it. But the tradition is not correct, and it would be interesting to quote the opinion of the leading traditionists about Ismail bin Abi Uwais, the first narrator on whose authority it is based. Mu'awiah bin Salih: "Ismail and his father are both unreliable." Yahya bin Mukhlab: "He (Ismail) is a liar and quite worthless." Imam Nasai: "He is weak and unreliable." Nasr bin Salma Maruzi: "He is a liar." Warqatni: "I do not believe in Ismail's authority for a corect tradition." Saif bin Mohammed: "He manufactures false traditions." Salma bin Shaib: "He has himself confessed to me that whenever there is a difference of opinion he invents a tradition on his own account." The authorities before us state with the utmost clarity that far from himself taking part in the practices of prevailing heathenism, the Apostle tried to induce his intimate friends to keep aloof from it.

24. Asaban, *Hizam; Musnad Imam Hanbal*, Vol. III, p. 463.

25. Istiab and Asabah.

***

Hashim Ali sahib –aur- Shah Hasan Ata ke Barey mein

by Prof. Parvaiz Talib

Aap Aligarh se duur rehkar bhee Aligarh ki anjuman sajaaye hue hain. Allah aapko aur himmat aur sehat de. Hashim Saheb par Prof Iqbal ka mazmoon bharpoor hai. Mera taqarrur bahaisiat ustad Hashim Saheb ke hee mubaarak haathon se hua. Taqarrur ke baad jab unki duayen lene haazri dee to farmaane lage ke Parvaiz Mian, it is not important from where you begin, what matters is where you end up... Unki shakhsiat ki amit chhaap aaj bhee dil par naqsh hai... Kamaal ke buzurg thai. Yahaan se waapsi ke baad bhee apne khutuut se rehnumaayi karte rahe. Allah unhe ghareek e rehmat kare aur unke darjaat baland se baland-tar karta rahe.

Shah Hasan Ata saheb ki tehriron ka zikr bhee maalumaati hai...Khush-naseeb hain woh ke aisee aulad naseeb huyi jsne unke kaam ko aage badhaaya. Yeh wohi Shah Hasan Ata hai jinka ghayebaane main zikr Mukhtar Masood ne apni kitab aawaz e dost ke sarojni naidu ki Aligarh aamad waale baab mein kiya hai... Koshish karuunga ke unki tehreeren haasil ho jaayen aur unka mutaala kar paaun. Charaaghan karte rahiye isee taraah. Charaagh se hee aur charaagh roshan honge.

***

On Hashim Ali Saheb –and- on Sufism:

by Zaheer Babar, USA

The article on Syed Hashim Ali Akhtar, covers different facets of his personality though more inclined towards his administrative achievements. There is a bit of sprinkle about literary contributions, interfaith activities in the US, and witty personality. One key element seems to be missing in the literary portrait is criticism, or pointing out some bad decisions that we all make in our life span and later think that those could have been done in a better way. The article is only about praise to the point of glorifying fairness and dictatorial actions in one breath.

As for Sufism, there seems to be a deliberate effort by the author to relate origins of Sufism to Islam. If, instead of "Islam", the author has concluded that it exists in all Divine faiths, it may be a more accurate statement. I think Sufism is a mindset that exists in every faith where it considers the structure and rituals as roadblocks or diversions for the free soul to make a connection with The Creator in its own way of expressing love and submission. This brings friction between Sufism and the Abrahamic faiths as they all have a structure to connect to God and put emphasis on structure as the driving vehicle to the same destination.